جلترنگ

قتیل شفائی

مکتبہ ج[illegible]

جلترنگ

جلترنگ

قتیلؔ شفائی

مکتبہ جدید لاہور

پبلشرز: مکتبہ جدید ۔ لاہور
پرنٹرز: سویرا آرٹ پریس ۔ لاہور

ترتیب

تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی
میرے من کی آس پرانی تیرے تن کی پیاس نئی

تو بگیا کی تتلی بن کر پھول پھول پر جھولے
کلی کلی سے پیار بڑھائے رت رت کے دکھ بھولے
ایک سماں ہے تجھ کو ساون ہو یا سرسوں پھولے

تیرا جوبن ایک پہیلی تیری آس نراس نئی
تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی

روپ ترنگ میں تیری منہ پھٹ چنچلتا اترائے
انگ انگ میں سجی سجائی سُندرتا بل کھائے
سنگ سنگ اَن دیکھے سپنوں کی شوبھا لہرائے
جیون کے ہر موڑ پہ تیری آس رچائے راس نئی
تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی
ایک اڑان سے تو اُکتائے بار بار پر تولے
ایک چال نہ بھائے تجھ کو قدم قدم پر ڈولے
اس پر بھی من مُورکھ میرا تیری ہی جے بولے
میرے ساتھ پرانی چھایا، کایا تیرے پاس نئی
تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی

بازار

جوانی، حسن، غمزے، عہد، پیماں، قہقہے، نغمے
رسیلے ہونٹ، شرمیلی نگاہیں، مرمریں باہیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!

خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

بھرے بازو، گٹھیلے جسم، چوڑے آہنی سینے
بلکتے پیٹ، روتی غیرتیں، سہمی ہوئی آہیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!

خریدارو!

بتاؤ کیا خریدو گے؟

زبانیں، دل، ارادے، فیصلے، جاں بازیاں، نعرے

یہ آئے دن کے ہنگامے، یہ رنگا رنگ تقریریں

یہاں ہر چیز بکتی ہے!

خریدارو!

بتاؤ کیا خریدو گے؟

صحافت، شاعری، تنقید، علم و فن، کتب خانے

قلم کے معجزے، فکر و نظر کی شوخ تصویریں،

یہاں ہر چیز بکتی ہے!

خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

اذانیں، سنکھ، حجرے، پاٹھ شالے، داڑھیاں، قشقے
یہ لمبی لمبی تسبیحیں، یہ موٹی موٹی مالائیں،
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟
علی الاعلان ہوتے ہیں یہاں سودے ضمیروں کے
یہ وہ بازار ہے جس میں فرشتے آکے بک جائیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

ایکسٹرا

نگار خانے کی سُرمئی بدلیوں میں اُلجھے ہوئے ستارے
شباب کی اِس بلند بستی سے کوئی کیونکر تجھے اُتارے
ترے بدن کے جواں تکّلے اک ایسا ماحول بن رہے ہیں
کہ جس کے پُرپیچ راہگذر آہٹوں کا سنگیت سُن رہے ہیں
تری یہ مجبور حُسن کاری فریب کامل بنی ہوئی ہے
ہر ایک ٹھوکر تری نظر میں نشانِ منزل بنی ہوئی ہے
مجھے تو ڈر ہے یہ قہقہے آخر آنسوؤں میں بدل نہ جائیں
بدن کے یہ تجربے تری عمر سے بھی آگے نکل نہ جائیں

یہ فن کے دیوتا جنھیں ترے فن کی نقرئی باس آ رہی ہے
اب ان کی فطرت برہنہ ہو کر کہیں کہیں ڈگمگا رہی ہے

تری نظر کا علیل سپنا نڈھال ہو کر لچک نہ جائے
ترے بدن کا بھرا کٹورہ کسی کے ہاتھوں چھلک نہ جائے

یہ چور بازار ہے چلن ہے، یہاں نہ گورے نچے نہ کالے
کوئی تبسّم فروش تاجر کہیں تجھے بھی نہ بیچ ڈالے

اگر تری سادگی کی چلمن سے کوئی "فنکار" جھانک لے گا
تو زندگی کا سہاگ تیرے فراق میں زہر پھانک لے گا

پیغام

ابھی پچھلے برس تو نے مجھے پیغام بھیجا تھا
کہ میں تیری تمنّاؤں کو خوابوں سے نہ بہلاؤں
ترے گاتے ہوئے ماحول کے زرّیں اندھیرے میں
بلکتی حسرتوں کا ایک بھی تارا نہ چمکاؤں
اگر تیری حنا بندی میں خونِ حسن شامل ہو
تو میں پسِ منظرِ حالات سے پردہ نہ سرکاؤں
کسی تہوار پر جب تو کھلونا بن کے رقصاں ہو
تو میں اس حال میں تکتا ہوا تجھ کو گذر جاؤں
مجھے اس سال بھی تو نے یہی پیغام بھیجا ہے

مجھے اس سال بھی تو نے مروّت کی قسم دے کر
بیانِ فکر کی آزاد گفتاری سے روکا ہے
اگر تیری غلط اندیشیوں پر مجھ کو رونا تھا
تو اس اقدام پر تو نے مری جرأت کو ٹوکا ہے
دروغِ مصلحت اندیش سے تو مطمئن ہوگی
مگر میری نگاہوں میں یہ ذلّت کا جھوکا ہے
محبت کو اگر پرکھیں تجارت کے اُصولوں پر
تو اپنی آدمیّت سے یہ اک رنگین دھوکا ہے
مجھے اگلے برس بھی کیا یہی پیغام آئے گا؟

اگر اگلے برس بھی تُو یہی پیغام بھیجے گی
تو میں احساس کی رفتار کو دو چند کر دوں گا

کچھ اس سے بھی زیادہ تیز کر کے دھڑکنیں دل کی
بزورِ شوق تجھ کو پیار کا پابند کر دوں گا
محبت کی صداقت کو سجاؤں گا نگاہوں میں
تلوّن پر میں اپنی فکر کے در بند کر دوں گا
نئے خوابوں سے تیری حسرتوں کو جگمگاؤں گا
ترے ایک ایک جلوے کو ضرورت مند کر دوں گا
مجھے پھر اور ہی تیرا کوئی پیغام آئے گا!

معذرت

مجھ سے پہلے بھی تری انجمنِ ناز میں آیا ہے کوئی
تری باتوں میں زر و سیم کی جھنکار سنی ہے میں نے
روح میں گونج اُٹھا پھر وہی قلّاش ندامت کا سوال
کیوں تری راہ میں اخلاص کی دیوار چُنی ہے میں نے

اس سے پہلے بھی کوئی شعلۂ جوّالا ضیا پاش رہا
اس سے پہلے بھی کسی آنچ کو محسوس کیا تھا میں نے
اس سے پہلے بھی (سسکتے ہوئے احساسِ ندامت کی قسم)
اپنی آنکھوں سے اُمڈتا ہُوا سیلاب پیا تھا میں نے

کل ترا پیار تُلا ریشم و کمخواب کی میزانوں میں
آج تعمیرِ وفا کون کرے جسم کی بنیادوں پر
میں تو اُس جلوۂ صد رنگ سے محروم بھی رہ کر خوش ہوں
قہقہے جس کو مقدّم رہیں انسان کی فریادوں پر

سندیسہ

اگر احساس کے شعلوں سے جلتا ہے ضمیر اُس کا
تو میں اس بے بسی کو بھی وفا کا نام دے دوں گا
اگر اس کے تلوّن میں کوئی طوفاں نہیں آیا
تو میں اُس کی تڑپ کو پیار کا انعام دے دوں گا
اگر پلکوں کی چلمن سے ہمکتا ہے کوئی آنسو،
تو میں اپنی مروّت کو صلائے عام دے دوں گا

کسی پیغام سے پہلے

کسی پیغام سے پہلے مگر مجھ کو یقیں آئے
کہ افسانے کبھی ماضی کے دُہرائے نہ جائیں گے

کھنکتی آنچ سے ہرگز نہ پگھلے گی کوئی حسرت
بدن کے زاوئے بازار میں لائے نہ جائیں گے
خلوصِ دلربائی کو خریدے گی نہ زرداری
محبت کو سنہرے طوق پہنائے نہ جائیں گے

کسی الزام سے پہلے

کسی الزام سے پہلے بھی لیکن سوچنا ہو گا
کہ جرمِ بے وفائی کا زمانے میں سبب کیا ہے
کبھی احساس کا جو رقص تھا اب کیا ہوا اس کو
جب آنکھوں میں محبت کی تمازت تھی تو اب کیا ہے
نظامِ زر کی بنیادوں سے مجھ کو پوچھنا ہو گا
یہ مجبوری، یہ محرومی، یہ سفاکی، یہ سب کیا ہے

ایک نظم

اے کسی گلشنِ زرّیں کی گراں قدر کلی
اپنی اُجڑی ہوئی مہکار چھُپا لے مجھ سے
اے کسی بسترِ کمخواب کی بے رنگ شکن
اپنا روندا ہوُا کردار چھُپا لے مجھ سے
اے کسی جنّتِ زرفام سے آنے والی
اپنا ٹوٹا ہوُا پندار چھُپا لے مجھ سے

تو نے اک بار کہا تھا مجھے تنہائی میں
پیار دولت کا پرستار نہیں ہو سکتا
زندگی حرص کے پہلو میں نہیں سو سکتی
جسم رُسوا سرِ بازار نہیں ہو سکتا
ولولے رُوح کے نیلام نہیں ہو سکتے
حسن ذلّت کا پرستار نہیں ہو سکتا

مصلحت آج مگر جیت چکی ہے تجھ کو
کوئی کس منہ سے کہے مونس و غمخوار تجھے
کوئی کس دل سے کہے پیار کی رانی تجھ کو
کوئی کس طرح کہے پیکرِ ایثار تجھے

تو نے بیچی ہے سرِ عام جوانی اپنی
گدگداتی ہے زر و سیم کی جھنکار تجھے

یہ ترا پیار ترے جسم کا سودا ہی سہی
اب تری رُوح ترے پاس نہیں آئے گی
یہ ترا دل کہ بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے
اس میں اب شدّتِ احساس نہیں آئے گی
تو نے ہر چند گراں نرخ یہ جلوے بیچے
یہ تجارت بھی تجھے راس نہیں آئے گی

دیکھ اس دورِ جہاں سوز کے ویرانے میں
لذّتِ جسم کے طوفان بہر گام اُٹھے

کیا یہی تجھ کو سکھایا ہے نظامِ زر نے
کہ محبت کا جنازہ سحر و شام اُٹھے
کیا یونہی پیار کی توقیر ہوا کرتی ہے
کہ مہکتی ہوئی ہر سانس کا نیلام اُٹھے

دیکھ اس دہر میں اربابِ ہوس کے ہاتھوں
آبروئے پیار کی مٹی میں مل جاتی ہے
حرص کا شور فضاؤں میں رچا جاتا ہے
بات اخلاص کی ہونٹوں میں سِلی جاتی ہے
سادگی حسن کا مجروح تبسّم بن کر
کسی جلّاد کے چہرے پہ کھلی جاتی ہے

تو کہ اب تجھ سے تجھے کوئی سروکار نہیں
بن کے تو کس کے لئے آئینہ رُو آتی ہے

یہ نمائش کی محبت اسے میں جانتا ہوں
سامنے میرے تو کیوں سہمی ہوئی آتی ہے

اب کوئی راز چھپانے سے نہیں چھپ سکتا
تیرے دامن سے مرے خون کی بُو آتی ہے

سرتاج

چلمن سے اُبھرتی ہیں کھنکتی ہوئی کرنیں
گاتی ہے فضا میں کوئی زرپوش کلائی
میں حلقۂ نغمات میں حیران کھڑا ہوں
آنکھوں سے سمیٹے ہوئے اک جشن طلائی

یہ جشنِ مسرّت، جسے تخلیق کیا ہے
آرام سے بیتے ہوئے پچاس برس نے
یہ قافلۂ عمر کی روندی ہوئی منزل
پوجا ہے جسے حرص کی آوازِ جرس نے

یہ سانس، یہ سوکھے ہوئے پتّوں کا ترنّم
یہ جسم، یہ ٹوٹا ہوا پیتل کا کٹورا
یہ رنگ، یہ تیزاب میں ڈوبی ہوئی چاندی
یہ عمر، یہ بھادوں کی ہواؤں کا ہلورا

کچھ بھی نہ سہی خون کی بے کیف حرارت
دولت نے اسے پیار کا حق دے تو دیا ہے،
گلچیں کی مچلتی ہوئی مشّاق نظر نے
کونپل کو خدا بارِ قلق دے تو دیا ہے

راتوں کا جبس ہو کہ گجر دم کی ہوائیں
گجروں کی یہ جھنکار جھروکے میں رہے گی
جب تک نہ حقائق سے ہٹا دے کوئی پردہ
عورت یونہی اخلاق کے دھوکے میں رہے گی

نگارِ سیمیں

سینہ ہے کہ بلّور کی شفّاف صراحی   باہیں ہیں کہ برسات کے مہکتے ہوئے جھولے
رفتار ہے یا صبح کا گاتا ہوا جھونکا   زلفیں ہیں کہ اُڑتے ہوئے پُرپیچ بگولے
یہ قد جو کھنک جائے تو کانسی کا کٹورا
یہ آنکھ جو اُٹھے تو ستاروں کو بھی چھُولے

اے رقص کے انداز میں جلتی ہوئی دیوی   آ میں تجھے آنکھوں کے شوالے میں سجا لُوں
آ وقت کے صحراؤں میں بھٹکی ہوئی جوگن   آ میں تجھے راہوں کے دھندلکے سے بچا لُوں
آ حرص کے شعلوں میں جھلستی ہوئی رانی
آ میں تجھے بھیگی ہوئی پلکوں میں چھپا لوں

یہ رات یہ حالات یہ تاریک اُجالے ایسے میں ترے جسم کو چین آ نہ سکے گا
اے شمع تری عمر پہ جو بیت رہی ہے بے درد زمانہ تجھے سمجھا نہ سکے گا

اک روز پگھل کر کسی آغوش میں کھو جا
ہر رات کا جلنا تجھے راس آ نہ سکے گا

زود پشیماں

چند سال اس طرف زندگی کے حسیں جلوہ زاروں سے منہ موڑ آئی ہوں میں
ایک نورنگ منزل کی خاطر کئی ہم سفر راہ میں چھوڑ آئی ہوں میں
میری آنکھوں میں چمکی سجیلی کرن
میرے سینے میں ناچی رسیلی لگن
میں نے آواز دی
میں نے پرواز کی
میں اُڑی اُڑ کے برسوں ادھر آ گئی
میں کہاں کھو گئی میں کدھر آ گئی

کیا یہی ہے وہ منزل کہ جس کے لئے ان گنت ہمسفر چھوڑ آئی ہوں میں

چند سال اس طرف زندگی کے حسیں جلوہ زاروں سے منہ موڑ آئی ہوں میں

میری آواز میں وہ کھنک بھی نہیں

میری پرواز کی وہ دھنک بھی نہیں

مجھ کو آواز دو

ذوقِ پرواز دو

میں انھیں راہگذاروں کی ہو جاؤنگی

میں انھیں جلوہ زاروں میں کھو جاؤنگی

چند سال اس طرف جن حسیں جلوہ زاروں، نظاروں سے منہ موڑ آئی ہوں میں

نو مولُود

دریچے کھول دو، پردے ہٹا دو ان کواڑوں سے
کہ میرے خون کی میٹھی حرارت دور تک پہنچے
وہ حسرت جو مری آنکھوں سے رہ رہ کر ہمکتی ہے
نشیبِ خاک سے اُڑ کر فرازِ طُور تک پہنچے

فرازِ طُور - جس پر اک تجلّی رقص فرما ہے
نشیبِ خاک کے ذرّوں کی دھڑکن سُن نہیں سکتا
وہ آنسو دیکھ کر بھی قہقہوں میں جھومنے والا
شرارے پھانک لیتا ہے ستارے چُن نہیں سکتا

مری سانسوں کی شہنائی تو میٹھی راگنی چھیڑے
مگر ہونٹوں کی لرزش پھیل کر فریاد بن جائے

مرے چہرے کی رعنائی تو اُجلی چاندنی ڈھالے
مگر آنکھوں کی حسرت درد کی بنیاد بن جائے

مری معصوم حیرانی بھی جانے کیا تماشا ہے
کہ جو بھی دیکھنے آئے سراپا یاد بن جائے

(یہاں اب تلخ یادوں کی نمائش کے سوا کیا ہے)

وہ یادیں تلملاتی ہیں ضمیرِ عہدِ ماضی میں
جنھیں یک رنگیٔ حالات نے نغمے سنائے تھے

وہ یادیں کلبلاتی ہیں دماغِ طاقِ نسیاں میں
جنھیں بے داغ ہاتھوں نے کبھی جھولے جھلائے تھے

وہ یادیں آہ وہ یادیں کسے اب ہوش ہے ان کا
وہ دن شاید کبھی اس گھر میں جھونکا بن کے آئے تھے

یہ دولت اور یہ اونچی حویلی بھی نہ تھی لیکن
تہی دستی کے عالم میں بھی اطمینان تھے کیا کیا
یہ میرے ہم سفر جب منزلِ ہستی پہ اُبھرے تھے
تو ان کی پاسبانی کے یہاں امکان تھے کیا کیا

مقدس ماں کے آنسو آج لیکن مجھ پہ ہنستے ہیں
کہ میرے دل کی دھڑکن میرا خالق سُن نہیں سکتا
وہ آنسو دیکھ کر بھی قہقہوں میں جھومنے والا
شرارے پھانک لیتا ہے ستارے چُن نہیں سکتا

خمیازہ

سال خوردہ ذہن پر اُگتے ہوئے غم کے نقوش
نیلگوں آنکھوں میں اندوہِ وفا بویا ہوا
خون کی حدّت رگوں کے جال میں اُلجھی ہوئی
سرخ چہرہ جھرّیوں کی سیج پر سویا ہوا
عمر کا بے وقت ماتم حسرتوں کی لاش پر
آرزوؤں کا کفن زہراب میں دھویا ہوا

کیا یہی وہ زندگی ہے جس پہ تجھ کو ناز ہے
بے مروّت یہ ترے انجام کا آغاز ہے

تو نے جس دولت کے بل پہ عشق کی یلغار کی
آج اس دولت کے جوبن پہ بڑھاپا آگیا
تو نے جس ملبوس سے ڈھانپے امارت کے جذام
حادثوں کا ہاتھ اس ملبوس کو اُلٹا گیا،
تو نے جن محلوں میں دیکھے حرص کے رنگین خواب
وقت کا بھونچال ان محلوں کے گنبد ڈھا گیا
جم چکا ہے خون اب تیرے دلِ بے صبر میں
دفن ہونا ہے تجھے اب حسرتوں کی قبر میں
یاد تو ہو گی تجھے اس شام کی افسردگی
جس نے ان پلکوں کی تربت پہ جلائے تھے چراغ
یاد تو ہو گا تجھے وہ آتشِ نخوت کا زور
جس کے شعلوں نے کسی کا پھونک ڈالا تھا باغ

یاد کر اس مفلس و مجبور کے چہرے کا رنگ
تو نے توڑا تھا کبھی جس کی محبت کا ایاغ
تجھ سے شاید انتقام اس کا نہ دیکھا جائے گا
اب ندامت پر تری وہ قہقہے برسائے گا

تو نے سمجھا تھا مرے سینے میں خنجر گھونپ کر
اس سے دنیا میں کوئی کہرام مچ سکتا نہیں
مفلسوں کا خون اس دنیا میں ارزاں ہی نہیں
بھیڑیوں کو اب مگر یہ زہر پچ سکتا نہیں،

اب تو ہر نمرود جل جائے گا اپنی آگ میں
وقت کی زد سے کوئی فرعون بچ سکتا نہیں
آ کہ دونوں سر جھکائیں وقت کی آواز پر
تو مرے انجام پر رو، میں ترے آغاز پر

شہر کے اس گوشے میں

سماعت جب کھنکتی ہے طرب خانے کی راہوں میں
تو منزل کے تصوّر سے قدم للچا ہی جاتے ہیں
اگر جیب و گریباں کی ہم آہنگی سلامت ہو
تو نغموں کی مروّت کے مقامات آ ہی جاتے ہیں

سنہری انگلیاں رُکتی ہیں جب سازوں کی شہ رگ پر
تو نغموں کی چہکتی سانس رک جاتی ہے سینے میں

دروغِ مصلحت آمیز بھی اک چیز ہے لیکن...!
چھلک جاتا ہے زہرابِ الم ھر آبگینے میں

تصوّرِ عمر کی اس حد پہ جا کر ہانپ جاتا ہے
جہاں اہلِ ہوس بیداد پر بیداد کرتے ہیں
بمجبوری تھرکتی ہے جوانی برسرِ محفل...!
بدن کے مسکراتے زاویے فریاد کرتے ہیں

نظر کی نغمگی، زلفوں کے بل، ہونٹوں کی شیرینی،
یہاں ہر چیز جھوٹے پیار پر مجبور ہوتی ہے
یہاں کردار کے اُجلے صنم ڈھالے نہیں جاتے
یہاں ہر زندگی گفتار پر مجبور ہوتی ہے

جھروکوں سے مہکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے فاقے
یہاں چُکتا ہے سودا زندگی کی التجاؤں کا..!
یہاں دن کو بدن تلتے ہیں میزانِ حکومت میں
یہاں جمتا ہے راتوں کو اکھاڑہ راہنماؤں کا

خریدارو یہاں ہر رات جشنِ عام ہوتا ہے
یہ وہ منڈی ہے جس میں پیار کا نیلام ہوتا ہے

ایک عورت ۔ ایک ایکٹریس

فلیش بیک

پلکوں پہ ہے ٹوٹے ہوئے پندار کا لاشہ
دیکھا ہے جوانی نے محبت کا تماشہ
ہونٹوں پہ خموشی کی تھکن ہانپ رہی ہے
آنکھوں میں ندامت کی زباں کانپ رہی ہے
پازیب میں زنجیر کی جھنکار ہو جیسے
ملبوس میں تقدیر کی پھنکار ہو جیسے
چہرے پہ امارت کی حسیں خاک ملی ہے
چاندی کے کھنکتے ہوئے سانچے میں ڈھلی ہے

سینے میں شرارے، نہ حرارت ہے بدن میں
اک لاش ہے لپٹی ہوئی ریشم کے کفن میں
اس لاش کو مدفن سے نکالا بھی گیا ہے
اس راز کو ہونٹوں پہ اچھالا بھی گیا ہے
اس راز کو جب اہلِ ہوس عام کریں گے
اس لاش کے انگ انگ کو نیلام کریں گے
یہ جنس کچھ اس طرح سے ہر رات بکے گی
اِس ہاتھ سے نکلے گی تو اُس ہاتھ بکے گی
کہتا ہے زمانہ مجھے منظور یہی ہے،
سرمائے کے ہر دیس کا دستور یہی ہے

کلوز اَپ

میٹھے لبوں پہ رنگ ہے برگِ گلاب سا
باتوں میں اک نشہ ہے صدائے رباب سا

ہر گام پر چھیال کے پُر کیف زمزمے
ہر راہ میں فسونِ نظر ہمرکاب سا

پُر پیچ گیسوؤں میں مہکتے ہوئے سے خواب
شانوں پہ ایک سایۂ برّاں سحاب سا

ماتھے پہ اک جلالِ ہنر مندیٔ جمال
آنکھوں میں احتیاط گزیدہ حجاب سا

خمدار ابروؤں میں کمانوں سا بانکپن
تیرِ نظر میں پیار بھرا اک عتاب سا

سینے کے مدوجزر میں بے رحم زمزمے
سینے کے زیر و بم میں سماں انقلاب سا
گاتی ہوئی سی روح میں بجتے ہیں جلترنگ
بلّور سے بدن میں لہو ہے شراب سا
دنیا کے ہر سوال کو چاندی میں تول کر
باہوں میں التفات بھرا اک جواب سا
ناگن بپھر کے آئی ہے عورت کے روپ میں
اک زہر بک رہا ہے حلاوت کے روپ میں

لانگ شاٹ

رات کی تاریکی میں جیسے دولھا کے قدموں کی چاپ
جیسے بھرے پُرے کنبے میں پیار کی ایک نظر بھی پاپ

جیسے لوٹ کے اِک سنّاٹا آئے بند محلکوں سے
مانگ رہی ہے یوں جیون کے سپنے بھیگی پلکوں سے
سینے کی دھڑکن میں بیتے وقت کی دھڑکن سنتی ہے
آنکھوں کی راہوں پر آشاؤں کے ٹکڑے چنتی ہے

وہ نغمے جو ناچ رہے تھے چاندی کی جھنکاروں میں
آج دراڑیں ڈال رہے ہیں کانوں کی دیواروں میں
وہ جبیں سر رکھ کر جن پر چاندنی راتیں سوئی ہیں
کون کہے اب وہ ہرجائی کس دنیا میں کھوئی ہیں
جسم کی اُجلی سیج پہ اب وہ رنگ رنگیلے پھول نہیں
پیار کا جھولا جھول کے سونا اب اس کا معمول نہیں

کل تک جو بہروپ رچا تھا آنکھوں کے آئینوں میں
گرد سا بن کر بیٹھ گیا ہے آج وہی قالینوں میں

یہ دولت جب مجبوروں کے پیٹ کا ایندھن بنتی ہے
پیار کی دیوی اطمینان کے بدلے آنسو جنتی ہے

عورت جس میں جنس بنی ہے اس بازار کو بند کرو
وقت کا بیوپاری کہتا ہے اس بیوپار کو بند کرو

تاجروں کے دیس میں

ماں۔ ترے افلاس کے سب واہمے بے سُود ہیں
میری پلکوں پہ ترے آنسو ابھی موجُود ہیں
میرے سینے میں تری ہی بے بسی کا درد ہے
تیرے چہرے کی طرح میرا بھی چہرہ زرد ہے
چھین لایا ہوں اگر میں تجھ سے اپنے آپ کو
ٹوک سکتی ہے تری ممتا مرے اس پاپ کو
لیکن اے بھوکے بڑھاپے کی مقدس رازدار
گھر پہ فاقے آج بھی کرتے ہیں میرا انتظار

دن ڈھلے پڑتا ہے جب پہلا قدم دہلیز پر
تیر جاتی ہے نظر کی مُردنی ہر چیز پر
رُخ پہ اطمینان کا بہروپ بھر لیتا ہوں میں
سو بہانے اپنی مجبوری سے کر لیتا ہوں میں
ماں! تری سادہ دلی ڈھلتی ہے جب تحریر میں
تلملاتی ہے نظر اک بے صدا زنجیر میں
تو کچھ اَن دیکھے محلکوں سے بلاتی ہے مجھے
پھر بھی تیری خود فریبی ڈھونڈ لاتی ہے مجھے
بے مروّت فکر کی ہر بات سُن لیتی ہے تو
موتیوں کے روپ میں کنکر بھی چُن لیتی ہے تو

تو سمجھتی ہے کہ میں چاروں طرف مشہور ہوں
کون سمجھائے تجھے میں کس قدر مجبور ہوں
کون اُس فن کو کرے گا جذب اپنی ذات میں
جو لگائے بھوک کے پیوند احساسات میں
جی میں آتا ہے کہ ایسے فن کا دامن چھوڑ دوں
میرے بس میں ہو تو شہرت کے پروں کو توڑ دوں

ماں — ! سمجھتا ہوں کہ مجھ سے کیا شکایت ہے تجھے
میری ہی مانند روٹی کی ضرورت ہے تجھے
تو نے پایا ہے اگر مجھ میں امارت کا سراغ
گونج اُٹھا ہے ترے احساسات سے میرا دماغ

تیرے جیتے جی اگرچہ میں بنا قاتل ترا

میرے سینے میں دھڑکتا ہے ابھی تک دل ترا

تیرے خوں سے آج بھی رگ رگ مری سیراب ہے

جس کی میں تعبیر ہوں تو وہ سلگتا خواب ہے

لیکن اے بھوکے بڑھاپے کی مقدس رازدار

گھر پہ فاقے آج بھی کرتے ہیں میرا انتظار

دُور، کوسوں دور تجھ سے علم و فن کے بھیس میں

بِک رہی ہے بھوک میری تاجروں کے دیس میں

ماں —! ترے نزدیک جس شہرت کا عظمت نام ہے

تاجروں کے دیس میں وہ چیز جنسِ خام ہے

رات بھر جب ذہن میں لوتا ہوں فن پارا کوئی
کاٹتا ہوں صبحدم ٹوٹا ہوا تارا کوئی

روشنی کس کو ملی ہے کرمکِ شب تاب سے
کس نے اطمینان پایا ہے فسونِ خواب سے

صبح سے جب شام تک کنگال ہو جاتا ہوں میں
آپ اپنے مال کا دلاّل ہو جاتا ہوں میں

کوڑیوں کے مول بک جاتے ہیں فن پارے مرے
بجھ گئے ہیں بارہا کیچڑ پہ انگارے مرے

لیکن اب حالات کی نبضوں پہ میرا ہاتھ ہے
ہر قدم پر آج تیری بھوک میرے ساتھ ہے

اب جو اپنے فن کو مستقبل پہ لہراؤں گا میں
اَن گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

مغویہ

یہ جواں سال امنگیں، یہ اچھوتے ارماں
کس کی جھولی میں یہ انمول ستارے بھر دوں
کون ہے جو مری زلفوں کی گھٹا سے کھیلے
کس کی آنکھوں میں سحرتاب اشارے بھر دوں

یہ جواں سال امنگیں، یہ اچھوتے ارماں
آج تک جسم کی دیوار سے آگے نہ بڑھے
جسم نے جبر کا ہر وار سہا ہے لیکن
یہ ہٹیلے کبھی انکار سے آگے نہ بڑھے

لُٹ گیا میرے بدن کا وہ تبسّم ، لیکن
اس سے عصمت کا تقدّس تو نہیں چھن سکتا
پیاس بجھتی ہے سرابوں کے نظاروں سے کہیں
جاگنے سے کوئی تارے تو نہیں گن سکتا

زندگانی کے عوض شرم و حیا کا نیلام
مجھ پہ اپنوں نے بھلا ظلم یہ توڑا کیوں تھا؟
میری الجھی ہوئی سانسوں کو پرکھنے والو
غیر کے رحم و کرم پر مجھے چھوڑا کیوں تھا؟

اُف یہ بیدرد زمانے کے المناک اُصول
آپ ہی ظلم کرے، آپ ہی انصاف کرے
لذّت و جبر کا فرق اس کو نہیں ہے معلوم؟
کون اس مصلحت اندیش کا دل صاف کرے

اُف یہ نفرت بھری نظروں کے بھیانک سائے
کاش اس رات کے پہلو میں سویرا ہوتا
یا مرے پاس بھی ہوتی کوئی تابندہ کرن
یا ہر اک سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا

ہائے یہ رات، یہ خلوت یہ اُلجھتے ہوئے خواب
کس کی آنکھوں میں سحر تاب اشارے بھر دوں
یہ جواں سال اُمنگیں، یہ اچھوتے ارماں
کس کی جھولی میں یہ انمول ستارے بھر دوں!

اقبال کے تاجر

رقص گاہوں سے مزاروں تک تو ہی تو جلوہ گر
کلغیوں کی شان تجھ سے گدڑیوں کا لال تو
کیسے کیسے مصر کے بازار ہیں تیرے لئے
دیکھ اپنے تاجروں کا نامۂ اعمال تو

تو نے دہقانوں کے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر
خوشۂ گندم کا ان کو دانہ دانہ دے دیا
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
بھوک نے کھیتوں کو حسن مجرمانہ دے دیا

تو نے مزدوروں کی محنت کے تحفّظ کے لئے
شہریاروں کی رعونت کو ملایا خاک میں
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
کچھ نہیں ہے مفلسوں کے دامنِ صد چاک میں

تو نے مذہب کے تقدّس کی حفاظت کے لئے
آدمیّت کو بچایا مفسدانہ بَیر سے
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
بھائی بھائی بھی نظر آنے لگے ہیں غیر سے

تو نے کیا کیا زیست کے رازِ دروں افشا کئے
تیرا ہر پیغام تاویلوں میں لیکن کھو گیا
تجھ کو پیرانِ سیاست بیچنے پر تُل گئے
جو بھی چاہا شہریاروں نے وہی کچھ ہو گیا

رقص گاہوں سے مزاروں تک ترے نغمے لٹے
کوچے کوچے میں ترے پیغام کو بیچا گیا،
اُف یہ تیرے تاجروں کی شاطرانہ ذہنیت
ہر نئے سودے میں تیرے نام کو بیچا گیا

فطرانہ

ایک آواز — خدا دیکھ رہا ہے سب کچھ
اپنے خالق کی پرستش کے لئے جھک جاؤ
آؤ پیاسو تمھیں دریا سے ملے گی شبنم
اس کے الطاف سے محروم نہ ہو رُک جاؤ

کھنکھناتی ہوئی جیبوں کے رسیلے نغمے
جھُوم کر جب بھی سماعت پہ بکھر جاتے ہیں
پیاس اور بھوک سے لتھڑے ہوئے مریل چہرے
سُرخیٔ زر کی تمازت سے نکھر جاتے ہیں

زندگی چیختی ہے۔ تم مجھے رسوا نہ کرو
پیٹ کہتا ہے کہ ایندھن تو بہر طور ملے
روح کہتی ہے کہ انسان کی توہین ہے یہ
جسم کہتا ہے نہیں اور ملے اور ملے

زندگی پیٹ کے سفّاک تقاضے لے کر
ہاتھ پھیلائے قطاروں میں کھڑی رہتی ہے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی زرکار چمک
اسی امّید پہ راہوں میں گڑی رہتی ہے

ایک آواز — مقدّر کی یہی ہے تقسیم؟
صبح نو تجھ کو ملے، مجھ کو سیہ رات ملے
گر خدا ہے تو اسے یہ نہ گوارا ہو گا،
ایک سونے میں تُلے ایک کو خیرات ملے

اِنسان

اک جنم جنم کا روگی اپنا روگ دکھانے آیا ــــ داتا ــــ جنم جنم دکھ پایا
دین دھرم کی اوٹ سے تیری کھوٹ مٹانے آیا ــــ داتا ــــ یہ کیا بھیس بنایا

تیرے دوارے دھنوانوں کے وارے نیارے دیکھے
تیرے چرنوں میں نردھن پہ چلتے آرے دیکھے
تیرے بھوکے پریم پجاری گور کنارے دیکھے

تیری اندھی نردھانے کیا کیا اندھیر مچایا ــــ داتا ــــ تجھ کو دھیان نہ آیا

تو نے کالے پیلے بچھو نگر نگر میں پالے
بول یہ کیا انیائے ہے او سانپوں کے رکھوالے
امرت نر دیوّں میں بانٹے مجھ کو زہر پیالے
کیا اس کارن ہی میں نے تجھ کو بھگوان بنایا — داتا — کیا مانگا کیا پایا

میں تیری اَن دیکھی صورت اپنے دھیان میں لاؤں
پربت کاٹ کے، پتھّر چاٹ کے، اپنا جی بہلاؤں
آپ بناؤں تیری مورت آپ ہی پھول چڑھاؤں
میں نے اپنی بھول سے جگمگ تیرا ڈھونگ رچایا — داتا — اپنا آپ لُٹایا
آج میں تیرے اُونچے شیش محل کو ڈھانے آیا — داتا — بات چُکانے آیا

جشنِ آزادی

مینہ برستا ہے تو دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھُول کھلتے ہیں تو گلشن پہ نکھار آتا ہے
لیکن اے جشنِ بہاراں کے نئے منتظمو،
خود فریبی سے کہیں دل کو قرار آتا ہے

تم اگر جشنِ بہاراں بھی کہو گے اس کو
موت کے گھاٹ یہ دھوکا بھی اُتر جائے گا
بادِ صرصر کو اگر تم نے کہا موجِ نسیم،
اس سے موسم میں کوئی فرق نہیں آئے گا

یہ گلستاں، یہ گلستاں میں سسکتے غنچے
اپنے اعمال کے پردے میں انھیں ڈھانپ تو لو
اقتدار آج بھی سرگرمِ سفر ہے لیکن
بے نواؤں کے ارادوں کو ذرا بھانپ تو لو

آج انسان کی عظمت نے کیا ہے اعلان
خود فریبی سے کوئی جی کو نہ بہلائے گا
جب تک آرائشِ گلزار نہیں ہو جاتی
کسی کونپل کسی غنچے کو نہ چین آئے گا

لیکن اے جشنِ بہاراں کے نئے منتظمو
یہ تماشا ہمیں بے کار نظر آتا ہے
مینہ برستا ہے نہ دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں نہ گلشن پہ نکھار آتا ہے

آرڈی ننس

جگمگاتے ہوئے ایوانِ شہنشاہی میں
جب سیہ فام قوانین جنم لیتے ہیں
جشنِ ثروت کے لئے امنِ جہاں کے دشمن
موت کے ہاتھوں میں قرطاس و قلم دیتے ہیں
مملکت حجلۂ زرکار میں بیٹھے بیٹھے
اپنے جمہور سے پیمانِ وفا مانگتی ہے
اور بیداریٔ جمہور وفا سے پہلے
اپنے تاریک گھروندوں میں ضیا مانگتی ہے

وہ ستارے کہ سحر تک ہے جوانی جن کی
ان کے ماتھوں پہ درخشانیٔ خورشید کہاں
وہ جفا کار جو انسان کا چہرہ نوچیں
ان سے آرائشِ آفاق کی اُمّید کہاں

زندگی بھوک مٹائے کہ ہوا سے کھیلے
مطمئن پیٹ نہیں ہے تو وفا کیسی ہے
برہنہ جسم کو تلقینِ حیا کیا معنی!
سانس رُک جائے تو پھر موجِ ہوا کیسی ہے

جب تڑپتا ہے کوئی درد کی شدّت لے کر
اپنے درماں کے لئے خدمتِ جم جاہی میں
حکم ہوتا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے
جگمگاتے ہوئے ایوانِ شہنشاہی میں

خواتینِ سرحد

کس سے فریاد کرے درۂ خیبر کا وقار
کس سے لپٹے مرے سرحد کی برہنہ چوٹی
کس کے دامن پہ گرائے کوئی جلتے آنسو
کس کی دہلیز میں بدلے گی یہ قسمت کھوٹی
بھوک اُگلتے ہوئے کھیتوں میں بچارے دہقاں
ہل چلاتے ہوئے چلّاتے ہیں روٹی روٹی
جن کو پروردۂ ذہنیتِ افرنگ کہیں،
کھا گئے نوچ کے جمہور کی بوٹی بوٹی

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک
جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے
جس میں غلّے کے نگہباں ہیں وہ گیدڑ جن سے
قحط و افلاس کے بھوتوں نے اماں چاہی ہے
یہ وہ خطّہ ہے کہ اربابِ ہوس کے ہاتھوں
جس کی تقدیر میں لکھی ہوئی گمراہی ہے
اُف یہ غیرت کے پرستار، یہ غم کے پیکر
دل میں طوفاں ہیں مگر چال میں روباہی ہے

لوگ چلّائیں مگر کاڑل ثروت کے اسیر
اپنے زرّین اصولوں پہ اڑے رہتے ہیں
یہ لٹیرے، یہ ہوس کار لٹیرے مل کر
فکرِ جمہور کی راہوں میں کھڑے رہتے ہیں

یہ وہ بے آب نگینے ہیں شہنشاہی کے
جو حکومت کی انگوٹھی میں جڑے رہتے ہیں
ان سے فریاد کی تلقین ہوئی ہے ہم کو
جن کے احساس پہ تالے سے پڑے رہتے ہیں

آؤ اے فاقہ زدہ قوم کے بھوکے شیرو
ہر بڑی توند کے ہاتھوں سے نوالا چھینیں
یہ ستمگر تو پلاؤ پہ جھپٹتے جائیں
اور ہم راہ میں بیٹھے ہوئے چاول بینیں
چند ڈاکو تو یہاں مالِ غنیمت بانٹیں
اور ہم صاف کریں ان کے لئے قالینیں
آؤ اے آبلہ پا راہروانِ منزل،
مسکراتی ہیں وہ گھوڑوں کی چمکتی زینیں

کشمیر

آگ اور خون کے سنگم پہ کھڑی ہوں کب سے
اپنے سہمے ہوئے ماحول کا لاشہ بن کر
جیسے حالات کے بپھرے ہوئے طوفانوں میں
رہ گئی ہو میری تو قیر تماشہ بن کر

یہ لپکتے ہوئے شعلے یہ ٹپکتا ہوا خون
زندگی لرزہ بر اندام ہوئی جاتی ہے
بربرّیت کسی قانون کی پابند نہیں
آدمیّت ہے کہ بدنام ہوئی جاتی ہے

مرے باغات، مری ڈل، مرے میٹھے جھرنے
ظلم کی گرم ہواؤں سے جھلس جائیں گے
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ مہلت پا کر
حرص کے سانپ مرے حسن کو ڈس جائیں گے

یہ رقابت کی کشاکش ہیں محبت کا زوال
کیا اسی ڈھب سے کوئی پیار کرے گا مجھ سے
حسن کو صبر گوارا ہے نہ دھوکہ، نہ فریب
کیوں کوئی پیار کا اصرار کرے گا مجھ سے

میں ہوں مختار جسے چاہوں بناؤں اپنا
جب کہ دنیا میں مساوات کا دَور آیا ہے
میرے جوبن پہ حرص کار نگاہیں نہ رکیں
میں نے سینے میں دھڑکتا ہوا دل پایا ہے

بیداری

جگمگاتے ہوئے مندر کے کلس ٹوٹ گئے
ایک فریاد سی جلنے لگی فانوسوں میں
اک پجاری نے عقیدت کا گلا گھونٹ دیا
سرسرانے لگی پھنکار سی فانوسوں میں

زندگی خاک بسر نوحہ کناں آ پہنچی
آدمیّت کے تہی دست صنم خانوں میں
دیوتاؤں کی سلگتی ہوئی خونیں آنکھیں
رقص کرنے کو بڑھی آتی ہیں انسانوں میں

دیویاں ریشم و کمخواب کے دوشالوں سے
اپنی عظمت کے تقدّس کو ہوا دیتی ہیں
لیکن احساس کے اس پار کوئی پوچھتا ہے
یہ جو اہرام کی چٹانیں ہمیں کیا دیتی ہیں

عوام

پھولوں کا شفّاف پسینہ (اوس بھی جس کو کہتے ہیں)
وقت کے اُڑتے دامن میں یوں ہیرے موتی جڑتا ہے
سوچ کے عالم میں جیسے فنکار کے گرم خیالوں پر
ایک نئے شاہکار کا ٹھنڈا سایہ پڑتا ہے

اوس کے موتی بن کر ہم نے وقت کا رُوپ نکھار دیا
وقت کی عظمت شام سویرے نام ہمارا لیتی ہے
ہم نے کیا کیا رنگ دیئے بے رنگ سیاست زاروں کو
سدا تمھاری ٹھنڈک کا ہر کلی سہارا لیتی ہے

آزادی کی دُھن میں ہم نے نوچا گرم شعاعوں کو
ایک جیت کی خاطر ہم نے اپنا سب کچھ ہارا بھی
لیکن اب تو رات کی تاریکی میں ہمیں چمکنا ہے
پھُولوں کا شفّاف پسینہ موتی بھی ہے تارا بھی

گیت

موسم کا سلونا جادو،
سپنوں کی سجیلی سیج پہ آشاؤں کے پھول سجائے
موسم کا سلونا جادو،

یہ جھیل سے گہرا نیل گگن، یہ روپ کمل، یہ رات
— چھیل چھبیلی مست پَوَن، یہ کرنوں کی برسات
نینوں سے نیند چرائے
موسم کا سلونا جادو،

موسم کے سلونے جادو میں جب ڈوب کے نکلے دھیان
پل پل دھیان کی لہروں پہ لہرائے اک بلوان—
ساجن کی یاد دلائے — موسم کا سلونا جادو!

سندور بھری یہ مانگ، یہ اس کا پیاسا پیاسا روپ
کس کے انگ میں رنگ بھرے بادل سے چھنتی دھوپ
کچھ گڈمڈ رنگ دکھائے — موسم کا سلونا جادو!

موسم کے بدلتے رنگوں میں اب جھلکے خون کا رنگ
پیٹ کا دھندا پران پتی کی گود میں ڈالے جنگ—
بارود کا مینہ برسائے — موسم کا سلونا جادو!

آکاش پہ ناچیں دھات کے ٹکڑے، رن میں برسے آگ
— دور سنہرے دیش کا راجہ گائے موت کا راگ
اب کس کے من کو بھائے — موسم کا سلونا جادو؛

پردیس میں لوبھی کتنے لوٹیں دھرتی ماں کی لاج
— نردیوں کی اس ٹولی میں اپنے بھی مہاراج
آپ اپنے سے شرمائے — موسم کا سلونا جادو؛

ہاتھوں میں رچی ہے مہندی پھر بھی مکھڑا جل تھل ہو
جس تن لاگے سو ہی جانے اور نہ جانے کو،
سینے میں آگ لگائے
موسم کا سلونا جادو؛

قطعات

کبھی کبھی ترے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے
مجھے بہار کی آہٹ سنائی دیتی ہے
تری نگاہ کی یہ بے حجاب سرگوشی
مجھے پھوار سی پڑتی دکھائی دیتی ہے

جب آسماں پہ لپکتا ہے بانکپن تیرا
تنی کمان سے کوئی تیر چھوٹ جاتا ہے
ترے بدن کے جواں سال زمزمے سن کر
غرور میری سماعت کا ٹوٹ جاتا ہے

اک ایسا وقت بھی آتا ہے چاندنی شب میں
مرا دماغ، مرا دل کہیں نہیں ہوتا،
ترا خیال کچھ ایسا نکھر کے آتا ہے
ترا وصال بھی اتنا حسیں نہیں ہوتا

سانسوں میں سمو کر وہ دہکتی ہوئی سانسیں
ریشم سے وہ گیسو مری باہوں میں بچھا دو
اے وقت کے پہلو میں دھڑکتے ہوئے سینو!
اے جام کے مانند کھنکتی ہوئی یادو!

ہر چیز کی ترتیب کا معیار جدا ہے
ایسے بھی ہیں منظر جو دکھائی نہیں دیتے
اے رقص کی دیوی تری پایل کے ترانے
محسوس تو ہوتے ہیں سنائی نہیں دیتے

مہکی ہوئی گفتار میں پھولوں کا تبسم
بہکی ہوئی رفتار میں جھونکوں کی روانی
ممکن ہے خزاؤں کا تصور ہی بدل دے
اے جانِ بہاراں تری گلپوش جوانی

غزل

نہ جانے آخرِ شب کیوں ستارے ڈوب جاتے ہیں
کہ ان کے ساتھ کچھ رنگیں نظارے ڈوب جاتے ہیں

یہ دھندلائی ہوئی صبحیں، یہ کجلائی ہوئی شامیں
انھیں کی فکر میں کچھ غم کے مارے ڈوب جاتے ہیں

بھنور سے بچ نکلنا تو کوئی مشکل نہیں لیکن
سفینے عین دریا کے کنارے ڈوب جاتے ہیں

کبھی اپنی رعونت بھی لگا دیتی ہے ساحل پہ
کبھی ہم ناخداؤں کے سہارے ڈوب جاتے ہیں

○

ہم اپنے دل کی دھڑکن کو بنا کر راز دار اپنا
ترے غم میں کیا کرتے ہیں اکثر انتظار اپنا

اگر دل ہے تو کلیوں کی اُداسی پر بھی تڑپے گا
اگر ہم ہیں تو ہوگا جانثاروں میں شمار اپنا

ترے قدموں پہ لا ڈالا اگر دل نے وقار اپنا
محبت کو زمانہ سونپ دے گا اختیار اپنا

جہانِ آرزو میں منزلِ راحت اُسی کی ہے
نچھاور کر دیا ہے جس پہ راہوں نے غبار اپنا

نہ جانے کونسی منزل پہ آ پہنچا ہے پیار اپنا
نہ ہم کو اعتبار اُن کا۔ نہ اُن کو اعتبار اپنا

گلوں کی نیم بسمل زندگی کا رقص جاری ہے
چمن والو! چمن میں دیکھ لو جشنِ بہار اپنا

○

تمنّاؤں کو سینے سے جدا ہونے نہیں دیتی
محبت درد سے نا آشنا ہونے نہیں دیتی

اگر آنکھوں کے پردے میں کوئی نغمہ سلامت ہو
تو خاموشی نظر کو بے صدا ہونے نہیں دیتی

مرے غم کو وفا کے آئینے میں دیکھنے والے
بس اک ضد ہے کہ توہینِ وفا ہونے نہیں دیتی

وہ تنہائی جسے تیرے تصوّر کا بھروسہ ہو
شبِ غم بھی سحر کی ابتدا ہونے نہیں دیتی

تمھیں کہہ دو وہ دیوانے کہاں سر پھوڑنے جائیں
جنھیں رسوا تمھاری خاکِ پا ہونے نہیں دیتی

○

خیال و خواب سے چل کر شعور تک پہنچے
تری تلاش میں ہم دور دور تک پہنچے

مذاقِ اہلِ نظر سے نہ کوئی کھیل سکا
پہنچنے والے غیاب و حضور تک پہنچے

اگر خلوص بھی شامل ہو رقصِ بسمل میں
تو بے بسی کا فسانہ غرور تک پہنچے

وہ گلبدن جنھیں گردِ سفر نہ راس آئی
پلٹ پلٹ کے حریر و سمور تک پہنچے

توہّمات کی شبنم میں آپ غلطاں تھے
ہم آنچ بن کے خرد کی، حضور تک پہنچے

مزاجِ دیدہ و دل میں کچھ اختلاف سا ہے
دگرنہ تلخیٔ غم بھی سرور تک پہنچے

قتیلؔ اس کی مروّت کا کیا ٹھکانہ ہے
وہ اک نظر جو دلِ ناصبور تک پہنچے

دلوں میں درد نگاہوں میں غم دھڑکتے ہیں
یہ سنگدل بھی تمھاری قسم دھڑکتے ہیں

خلوصِ شوق سے ربطِ جمال کیا معنی؟
کنارِ حسن میں دام و درم دھڑکتے ہیں

لہو کی بوند نہیں گرچہ سنگ و آہن میں
بہ پاسِ حرمتِ آذر صنم دھڑکتے ہیں

یہ میرا حسنِ نظر ہے کہ تیری شانِ سفر
بقدرِ دل ترے نقشِ قدم دھڑکتے ہیں

سکونِ خاطرِ دل بھی ہے کوئی چیز، مگر
کچھ ایسے دل بھی ہیں جو دم بدم دھڑکتے ہیں

دھڑک رہا ہے کچھ ایسے ترے خیال میں دل
مری نگاہ میں لوح و قلم دھڑکتے ہیں

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
قتیلؔ وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

○

چمن چمن فریبِ رنگ و بُو ہے اور کچھ نہیں
بس اک جمالِ خام چار سُو ہے اور کچھ نہیں

قفس میں آشیاں کا نام سن کے مطمئن نہ ہو
یہ باغباں کا حسنِ گفتگو ہے اور کچھ نہیں

خمار ہے کہاں کہ دل کی تشنگی بجھائیے
اس انجمن میں سایۂ سبُو ہے اور کچھ نہیں

تمھیں گلوں کی بے بسی میں حسن کی تلاش ہے
یہ جستجو برائے جستجو ہے اور کچھ نہیں

کھٹک رہی ہے جو ابھی ضمیرِ کائنات میں
لُٹی ہوئی بشر کی آبرو ہے اور کچھ نہیں

○

نفس نفس خوشی گذارتے چلے گئے
ترے مریضِ غم تجھے پکارتے چلے گئے

قدم قدم پہ مصلحت غبار بن کے چھا گئی
مگر ہم اپنی راہ کو سنوارتے چلے گئے

یہ اور بات ہے کہ زندگی بھنور کی زد میں تھی
وگرنہ ہم تو سب کو پار اُتارتے چلے گئے

انھیں کے ترکشوں سے پوچھ منزلیں نصیب کی
وہ لوگ جو خلا میں تیر مارتے چلے گئے

تمھاری انجمن کے ہم وہی بجھے چراغ ہیں
جو تیرگی کو اور بھی نکھارتے چلے گئے

ترے لئے جو کھو گئے ہیں زندگی کے کھیل ہیں
اگر وہ جیت جیت کر بھی ہارتے چلے گئے؟

مرے نڈھال ولولو! تمھیں کہاں سے لاؤں میں
نہ جانے تم کہاں کہاں سدھارتے چلے گئے

○

پہلے مزاجِ راہگذر جان جائیے
پھر گردِ راہ جو بھی کہے مان جائیے

کچھ بے ریا اگر ہے تو دربانِ میکدہ
دیر و حرم میں بے سر و سامان جائیے

کچھ کہہ رہی ہیں آپکے سینے کی دھڑکنیں
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے

اِک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے

اپنی غزل قتیلؔ وہ کوئل کی کُوک ہے
جس کی تڑپ کو دور سے پہچان جائیے

○

لہرا کے دل نگاہ کے زینے میں آگیا
اک حسن زندگی کے قرینے میں آگیا

دیوار بن گیا ہے بھنور کی اساس پر
ساحل کا ہر غرور سفینے میں آگیا

اے دوست اپنی کیفیتِ برہمی تو دیکھ
کتنا حسین رنگ نگینے میں آگیا

اب تجھ سے کیا غرض ہمیں اے مرگِ ناگہاں
تیرا ہر اک مزا ہمیں جینے میں آگیا

یوں حسرتوں میں گھل کے دھڑکتی ہے بیخودی
جیسے کسی کا دل مرے سینے میں آگیا

○

چاند کی چاندی جب سورج کے سونے میں گھُل جاتی ہے
ایک نشیلی آس ہماری آنکھوں سے دُھل جاتی ہے

یوں محسوس ہوا ہے مجھ کو قسمت کی تاریکی سے
دُور اُفق پر جیسے تو کھولے ہوئے کاکل جاتی ہے

وہ فرزانے ہم دیوانوں سے کیا آنکھ ملائیں گے
جن کی نیّت چمکیلی جھنکاروں میں تُل جاتی ہے

بستی بستی پھیل رہے ہیں آج ہمارے افسانے
باغ سے باہر بھی تو پیارے خوشبوئے گُل جاتی ہے

درد کی یہ بیداری اُن کے ظلم پہ ہی موقوف نہیں
اکثر پیار کی آہٹ سے بھی آنکھ مری کھُل جاتی ہے

○

امیدوں کے بند جھروکے وقت نے پھر سے کھول دیئے
جب آنچل کی اوٹ سے تو نے بول رسیلے بول دیئے
ایک تصوّر — ایک چھناکا اور وہی پھر خاموشی
جس نے ماضی کی آنکھوں میں میٹھے سپنے گھول دیئے
دُور خلاء کے پھیلاؤ میں جانے کیا کچھ دیکھ لیا
یاد کے سہمے پنچھی نے پھر اُڑنے کو پر تول دیئے
کوئی بتائے سینے میں کیا سانس نہیں جم جائے گی
پلکوں نے جب رخساروں پر پگھلے موتی رول دیئے
پچھلے سال بھی جشن ہوا تھا اب کے سال بھی جشن ہوا
ایک نئے دل کے زخم سئے تھے ایک نئے ٹانکے کھول دیئے

○

پیار کی ہار سے ڈرنا کیسا پیار کی ہار بھی جیت ہے پیارے
ٹوٹے دل کی ٹیسوں میں بھی ایک سہانا گیت ہے پیارے

پیار کے دکھڑے قدم قدم پر ایک اچھوتی راہ سجھائیں
ورنہ اس اندھیارے جگ میں کون کسی کا میت ہے پیارے

اُجلی سیج پہ سونے والے پیار کی سندرتا کیا جانیں
پریمی کی پلکوں پر موتی، سانسوں میں سنگیت ہے پیارے

اپنی آشاؤں کی کلیاں اس دنیا سے اوجھل کر لے
پھول پہ دھول اڑا کر ہنسنا اس دنیا کی ریت ہے پیارے

رات کے گہرے سناٹے میں شبنم بن کر رونے والی
یا چندا کی ڈھلتی چھایا یا پنچھی کی پریت ہے پیارے

○

پیار تمھارا بھول تو جاؤں، لیکن پیار تمھارا ہے
یہ اک میٹھا زہر سہی یہ زہر بھی آج گوارا ہے

ہانپ گئے پتوار، سفینے چلتے چلتے چور ہوئے
یہ ہے بھنور تو اے ملّاحو کتنی دور کنارا ہے

ہم تو ایک انوکھی ضد میں اپنی جان پہ کھیل گئے
تمھیں بتاؤ اجڑی رُت کیا جیتا کیا ہارا ہے

او بے رحم مسافر ہنس کر ساحل کی توہین نہ کر
ہم نے اپنی ناؤ ڈبو کر تجھ کو پار اتارا ہے

گھنگھور گھٹا کے آنچل کو جب کالی رات نچوڑ گئی
اک تنہائی کو چین ملا، اک تنہائی دم توڑ گئی

اے وقت کے اندھے رکھوالو! یہ راز تو ہم بھی جانتے ہیں
بے وجہ تمہاری آنکھوں سے کیوں بینائی منہ موڑ گئی

اک وہ بھی سفینہ تھا اپنا جو ساحل ساحل گھوم گیا
اک یہ بھی ہماری کشتی ہے جو لہروں میں سر پھوڑ گئی

ہر چند نظر نے تاروں پہ شبخون تو مارا ہے لیکن
یہ رات سحر کے دامن پر کچھ داغ لہو کے چھوڑ گئی

انسان کا روشن مستقبل جس وقت چراغِ راہ بنا
ہر منزل اپنے قدموں سے تاریخ کا ناطہ جوڑ گئی

بے کیف جوانی میں کیا کیا سامان خریدے جاتے ہیں
آہوں کے بگولے اشکوں کے طوفان خریدے جاتے ہیں

دل سے تو کوئی کیا چاہے گا اس اجڑے ہوئے کاشانے کو
مجبوری کا یہ عالم ہے مہمان خریدے جاتے ہیں

ہر چیز کا سودا چکتا ہے دن رات بھرے بازاروں میں
جھنکاریں بیچی جاتی ہیں ایمان خریدے جاتے ہیں

اک بات بھی ہوتی تُل جاتے ہم سونے کی میزانوں میں
افسوس یہاں دو کوڑی میں انسان خریدے جاتے ہیں

ضمیرِ لالہ و گل کی پکار بن کے اُٹھو
اُٹھو تو شعلۂ رنگِ بہار بن کے اُٹھو

تمھاری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے تارے
دلوں میں دردِ غمِ انتظار بن کے اُٹھو

بڑھو خلوصِ تہوّر سے جانبِ منزل
غرورِ گردِ سرِ راہگذار بن کے اُٹھو

ابھی خزاں کے تلاطم میں ہے سفینۂ گل
روش روش سے نشانِ وقار بن کے اُٹھو

نکھر نکھر کے ملے گا جمالِ سرو و سمن
سرورِ خونِ رگِ شاخسار بن کے اُٹھو

تمھی پہ وقت کی صورت گری بھی لازم ہے
کبھی تو خالقِ لیل و نہار بن کے اُٹھو

پھر وہی چیخیں — امیروں کو نہ جانے کیا ہوا
جل نہیں اُٹھتے ذخیروں کو نہ جانے کیا ہوا

خیر مقدم ہو رہا ہے ہر نئے صیاد کا
اہلِ گلشن کے ضمیروں کو نہ جانے کیا ہوا

ہائے یہ سونے کا دریا ہائے پیاسی زندگی
میرے ہاتھوں کی لکیروں کو نہ جانے کیا ہوا

بام پر آنکھیں لگی ہیں اور قدم اُٹھتے نہیں
چلتے چلتے راہگیروں کو نہ جانے کیا ہوا

ایک بھی نغمہ سلاسل سے نہ پیدا کر سکے
آج زندہ دل اسیروں کو نہ جانے کیا ہوا

عشق جلووں کو اگر دعوتِ پرواز نہ دے
کوئی بھی دیکھنے والا تجھے آواز نہ دے

میں نے ہر چند بلکتے ہوئے شب کاٹی ہے
پھر بھی اے درد مجھے طعنۂ دمساز نہ دے

ہمصفیروں کا بھروسہ ہی بہت ہے مجھ کو
اب خدارا کوئی صیّاد کو آواز نہ دے

تجھ سے کٹ کر بھی میں انجام کو بہلا لوں گا
اپنے آنسو مجھے اے خندۂ آغاز نہ دے

ان کے پہلو میں دھڑکنا تو بجا ہے، لیکن
اس قدر دور سے اے دل مجھے آواز نہ دے

میں نے بیداریٔ انساں کی قسم کھائی ہے
اپنی تاثیر مجھے اے نگہِ ناز نہ دے

بیچ کر حسن چمن شانِ چمن کہلاؤں
دینے والے مجھے ایسا کوئی اعزاز نہ دے

گلاب کی پنکھڑی پہ جیسے کوئی کرن جھلملا رہی ہے
تمہارے یاقوت سے لبوں پر نگاہ کو نیند آ رہی ہے
یہ اک تقاضا کہ جیسے تالاب میں کوئی بُلبلا سا ٹوٹے
یہ التفاتِ جمال تیرا کہ رات باہوں میں آ رہی ہے
ترے بدن کی ملاحتوں کے یہ پے بہ پے عطر پاش جلوے
کہ جیسے تانبے کی طشتری سے گلاب کی بُو آ رہی ہے
تمہاری باہوں کے لہلہاتے فریب میں آ گئے مسافر
قدم رُکے بھی تو ہم نے جانا کہ ہم کو منزل بلا رہی ہے
کبھی کبھی عارضوں کے شعلے نگاہ کو یوں جھلس گئے ہیں
کہ جیسے برفاب کی صراحی شفق سے آنکھیں ملا رہی ہے

چاندنی کے سائے میں جب چکور سوتا ہے
انتظار ہنستا ہے، اختیار روتا ہے

رحم کی توقع اور آسمان والے سے؟
آدمی کے پہلو میں ایک دل تو ہوتا ہے

آئینے میں آئینہ کس کی شکل دیکھے گا
مفلسوں کی دنیا میں عشق عمر کھوتا ہے

دم بخود ہے اک دنیا حیرتوں کے ساحل پر
کون تیرنے والا اب کسے ڈبوتا ہے

نگاہوں کی خاموش فریاد سُن کر کوئی زیرِ لب مسکرانے لگا ہے
اگر شیوۂ دلنوازی یہی ہے تو ہوش اپنے دل کو بھی آنے لگا ہے
ترے پیار سے جورِ اغیار بہتر کہ اس میں کوئی مصلحت تو نہ ہوگی
یہ کیا دل لگی ہے کہ تو ہم سے آنکھیں ملاتے ہی، دامن بچانے لگا ہے
تری چوڑیوں کے رسیلے چھناکے سلاسل کی جھنکار سے کم نہیں تھے
مگر اب کوئی حادثہ زندگی کا سماعت سے پردے اُٹھانے لگا ہے
جوانی کے بے کیف لمحوں نے اکثر انوکھے سہارے دیئے ہیں
اکیلے میں یوں بھی نگاہیں اٹھی ہیں کہ جیسے کوئی چھم سے آنے لگا ہے
قتیلؔ آج تک دوستی کے بھرم میں کچھ اس ڈھب کے انساں تراشے ہیں میں نے
کہ جن کی مرمّت کا ایک ایک صدمہ رگِ جاں میں ٹیسیں اٹھانے لگا ہے

ہونٹوں پہ مسکراہٹ، آنکھوں میں ہے نمی سی
وہ سامنے ہیں پھر بھی باقی ہے کچھ کمی سی

الفت میں دو دلوں کی کیفیتیں نہ پوچھو
یہ غم الگ سا، رنجش وہ باہمی سی

اک برق سیم تن کی یہ قربتِ فراواں!
شعلوں میں آ پڑی ہے اک رات شبنمی سی

یہ لمسِ لب بہ لب میں اک بیخودی کا عالم
رفتارِ دو جہاں ہو جیسے تھمی تھمی سی

احساس کی حدوں میں سہلا رہی ہے دل کو
اک پرتوِ صبا کی آواز ریشمی سی ،

برپا قتیل کب سے اک جشنِ مستقل ہے
رہتی ہے حسرتوں کی دل میں ہماہمی سی

وہ بیٹھے ہیں پسِ چلمن حجاب ایسے بھی ہوتے ہیں
برہنہ جو کریں دل کو نقاب ایسے بھی ہوتے ہیں

سوا پہلے سے بھی کر دی کسی نے تشنگی دل کی
جو بِن برسے پلٹ جائیں سحاب ایسے بھی ہوتے ہیں

سحر کے بعد بھی آنکھیں ترستی ہیں شعاعوں کو
نہ ہو جن میں اجالا آفتاب ایسے بھی ہوتے ہیں

گلے میں طوق، پیروں میں سلاسل، آنکھ میں شعلے
ہم ان کی انجمن میں باریاب ایسے بھی ہوتے ہیں

کسی کا عکس بن جاتی ہے اپنی شکل بھی جن میں
کچھ آئینے بہ فیضانِ شباب ایسے بھی ہوتے ہیں

بہ پاسِ گریۂ شبنم بھی گل خاموش ہیں ــــ ورنہ
شرر جن کی قسم کھائیں گلاب ایسے بھی ہوتے ہیں

پریشاں ہے ہر اک شاخِ سمن، زنجیرِ سنبل سے
چمن والو چمن میں انقلاب ایسے بھی ہوتے ہیں

ترے ستم کے قرینے کہاں کہاں نہ ملے
بھنور کے ساتھ سفینے کہاں کہاں نہ ملے

بچی نہ کوئی بھی منزل ہمارے اشکوں سے
یہ دل گداز نگینے کہاں کہاں نہ ملے

نہ مل سکے تو فرازِ جمال تک نہ ملے
ملے تو درد کے زینے کہاں کہاں نہ ملے

بنے فلک پہ ستارے تو آنکھ میں آنسو!
وہ غم دیئے جو کسی نے کہاں کہاں نہ ملے

جگر کی ٹیس ہیں، قلب و نظر کی حیرت میں
محبّتوں کے دفینے کہاں کہاں نہ ملے

جبینِ گل پہ ہے لرزاں ستارۂ شبنم
ندامتوں کے پسینے کہاں کہاں نہ ملے

مکتبہ جدید

معیار اور حسن

قائم رکھنے والا ادارہ

ایک قیمتی مجموعۂ کلام پیش کرتا ہے

ترانۂ وحشت

"میں ایک عرصہ سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں ۔ اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں ۔ دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا ۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں ۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابل داد ہے ۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے سو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے ۔" —— علامہ اقبال

"رضا علی وحشت زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسن کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہئے"۔ —— حسرت موہانی

"دیوان وحشت کے مطالعہ سے میرے دل میں بلامبالغہ ایک عجیب کشش پیدا ہوئی ہے"۔ —— مولانا حالی

مکتبہ جدید لاہور